ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت
ابتداء، فروغ اور دور انحطاط

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی☆

ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کی روایت تیرہویں صدی عیسوی سے ملتی ہے۔ اس میں بعض صوفیائے کرام کا بھی حصہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زمانے سے صوفیاء نے ہندوستان میں خانقاہیں تو قائم ہی کیں مگر بعض صوفیاء نے امام باڑے بھی تعمیر کیے۔ مندر اور مسجد، دونوں کے دروازے دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے لیے بند تھے۔ خانقاہ اور امام باڑے کا مزاج ان سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے دروازے دوسرے مذاہب کے لوگوں کے لیے بھی کھلے ہوئے تھے اور وہ مزاج آج تک قائم ہے۔ یہاں ہونے والی مجالس میں بلاتفریق مذہب وملت لوگ شریک ہوتے ہیں۔ عزاداری امام حسینؑ کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور عہد سلطنت ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک، دوسرا دور ۱۵۲۶ء سے ۱۷۵۷ء تک، تیسرا دور ۱۷۵۷ء سے ۱۹۴۷ تک اور چوتھا دور ۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ۔

عزاداری امام حسینؑ کی بنیاد قرآن کے ۲۵ ویں پارے کی ۳۲ ویں آیت ہے: قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی۔ (کہہ دیجیے کہ میں تم سے اجر طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو۔) اہل سنت اور اہل تشیع کے متفقہ دینی پیشوا حضرت میر سید علی ہمدانی علیہ الرحمہ نے تو اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا نام انہوں نے مودۃالقربی رکھا۔ اس آیت کی تفسیر وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اے لوگو! تم خدا کو دوست رکھو اس لیے کہ اس نے اپنی نعمتیں تم کو عطا فرمائیں اور محبتِ خدا کے لیے مجھ سے محبت رکھو اور میری محبت کے لیے میرے اہل بیت کو دوست رکھو۔ پس جب کہ آل نبیؐ کی دوستی کی بابت سوال کیا گیا ہے اور وہ ہم سے طلب کی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے حبیب عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ

☆ شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اپنی امت سے اپنے ذوی القربی کی دوستی کے سوا اور کچھ طلب نہ کریں اور یہ دوستی ان کے لیے باعث نجاتِ آخرت ہے اور آں حضرتؐ اور ان کی آل اطہار سے توسل کا ذریعہ ہے۔ جو کوئی خدا تک پہنچے اور اس کی جناب میں مقبول ہونے کا طالب ہو اس پر واجب ہے کہ رسول خدا سے محبت رکھے اور اہل بیت رسول خدا سے محبت رکھے اور اہل بیت رسول کی دوستی اختیار کرے اور یہ بات آں حضرت کے آل اطہار کے فضائل کی معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی''۔

آخر میں میر سید علی ہمدانی فرماتے ہیں کہ:''میں نے اس کتاب کا نام مودۃ القربی [۱] رکھا تاکہ مجھ کو اللہ تعالی اور اس کو ان حضرات سے میرے ملاقی ہونے کا ذریعہ بنائے گا اور ان کے ذریعے سے مجھ کو نجات عطا فرمائے گا۔

ایک رباعی میں فرماتے ہیں:

گر حبِ علی و آلِ نبوت نبود　　امید شفاعت ز رسولت نبود
ور طاعتِ حق جملہ بجا آری تو　　بی مہرِ علی ہیچ قبولت نبود

صوفیائے کرام اسلام پر قائم تھے۔ ایک قرآن، دوسرے سنت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور تیسرے محبت اہل بیت رسولؐ۔ امام جعفر صادق صوفی کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: "من عاشق فی باطن الرسول فهو صوفی"۔[۲] جو شخص اخلاق رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے آراستہ ہوجائے اور اس امر کو اختیار کرے جو رسول خدا نے اختیار فرمایا اور رغبت کرے اس طرف جدھر رسولؐ نے رغبت فرمائی اور پرہیز کرے اس سے جسے رسول نے چھوڑا تو گویا اس نے صفائے قلب حاصل کرلیا۔ صوفیا نے کبھی اپنے آپ کو کسی فرقے سے منسلک نہیں کیا۔ کسی صوفی کے ملفوظات میں یہ نہیں ملتا کہ ان کا تعلق کسی خاص فرقے سے تھا۔ وہ فرقہ واریت کے اصولی طور سے قائل ہی نہ تھے۔ ان کی خانقاہیں اسلامی اتحاد کا بڑا قوی و مستحکم حصار تھیں جہاں باہمی اخوت اور ہمدردی کی پائیدار بنیادیں پڑی تھیں۔

ہندوستان آکر صوفیاء نے اسلام کی تبلیغ کی۔ قرآن و سنت نبویؐ پر عمل کرنے کی ہدایت اور اہل

۱- میر سید علی ہمدانی، مودۃ القربی، قلمی نسخہ، کتب خانہ سید شاہ خیرات علی، جلالی، ضلع علی گڑھ، تفصیل کے لیے حکیم سید محمد کمال الدین حسین صاحب، مودۃ القربی

۲- حکیم سید محمد کمال الدین حسین، ذخیرہ جلالی کے چار اہم مخطوطات، خدابخش جرنل ۲۹-۴۷، ص ۱۲۷

بیت نبویؐ سے محبت۔ ان کی تبلیغ کے یہی دو محور تھے۔ صوفیا اپنے دور دراز وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور ہندوستان کے مختلف شہروں، قصبات اور گاؤں میں سکونت اختیار کر کے اپنی خانقاہوں کی بنیاد ڈالی اور اس طرح انہوں نے شمالی ہندوستان میں اپنی روحانی ولایتیں قائم کیں۔ کئی صوفی سلسلے آئے جن میں چشتی اور سہروردی سلسلوں نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ چشتی صوفیاء نے پہلے اجمیر اور اس کے بعد دہلی کو اپنا مرکز بنایا۔ سہروردی صوفیاء نے ملتان کو اپنا مرکز بنایا۔ ان صوفیاء نے خاص طور سے قصبات اور گاؤں میں تبلیغ کا کام کیا۔ قصبات اور گاؤں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ان حالات میں وہاں جا کر رہنا خود ایک جہاد تھا اس لیے کہ صوفیاء صرف مسلمانوں میں ہی تبلیغ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ہندوؤں کے درمیان رہ کر بھی تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے خانقاہ کے دروازے ہندوؤں کے لیے کھول دیئے۔ صوفیاء کے اس تبلیغی مشن نے ہندوؤں کو کافی متاثر کیا اور اس طرح سے اسلام کی تعلیمات ہندوؤں تک پہنچیں۔

نہ جانے کیوں شیعہ حضرات میں صوفی تحریک اور صوفیاء کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوگیا یا پیدا کر دیا گیا کہ تصوف اور صوفیاء سے شیعوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی وجہ لاعلمی بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح اہل سنت حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ شیعوں کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ ۱۶ویں صدی عیسوی کے ایک شیعہ عالم قاضی سید نوراللہ شوشتری نے اپنی کتاب مجالس المؤمنین[۱] میں ایک باب تصوف پر بھی قائم کیا ہے اور اس کے متعلق مسائل سے بحث کی ہے اور اسی کے ساتھ کچھ صوفیاء کی سوانح بھی قلمبند کی ہیں اور تصوف کو مذہب حقہ کہا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے زیادہ تر سادات اثناءعشری کے مورث اعلی صوفیا ہی تھے۔ سادات امروہہ ضلع مرادآباد کے سید شرف الدین شاہ ولایت، سادات میمن، ضلع بجنور کے سید اشرف، سادات سری نگر اور سادات جلالی ضلع علی گڑھ کے میر سید علی ہمدانی، سادات سرسی ضلع مرادآباد کے شاہ ولایت اور اسی طرح سے زیادہ تر دوسرے قصبات کے سادات اثناعشری بھی صوفیاء ہی کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

انہی صوفیاء نے مودۃ القربی کے لیے عزاداری امام حسینؑ کو ایک ذریعہ بنایا۔ نذر و نیاز کے طریقے

۱۔ سید نور اللہ شوشتری، مجالس المؤمنین، قلمی نسخہ انڈیا آفس کلکشن، لندن، اس مخطوطے کے آخر میں قاضی سید نوراللہ شوشتری کی اپنے قلم سے تحریر موجود ہے۔

اور عزاداری کی رسومات صوفیاء نے قائم کیں۔ یہ سب توسل اہل بیت کے طریقے ہیں۔ عزاداری امام حسینؑ یا اس کی رسومات اور نذر و نیاز کے طریقے کہیں لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ صوفیاء کے مزاج کے مطابق یہ طریقے سینہ بہ سینہ، پشت در پشت، ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے رہے۔ ۱۳ویں صدی عیسوی سے لے کر ۲۰ ویں صدی کے اختتام تک عزاداری امام حسینؑ اور اس کی رسومات سے متعلق کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ حسین علی کربلائی نے تحفۃ العوام [۱-۲] لکھی جس پر زیادہ تر شیعہ علماء و مجتہدین توثیق کرتے رہے۔ اس پر آٹھ جید علمائے اثنا عشری کے دستخط موجود ہیں۔ صفحہ ۱۴۲ سے ۱۵۴ تک ۲۰ ویں باب میں ماہ محرم کے اعمال ہیں۔ یہ اعمال شب عاشورہ سے لے کر آخر روز عاشورہ تک کے ہیں۔ حالانکہ حصہ سوم و چہارم کا بعد میں اضافہ بھی کیا گیا لیکن اس اضافہ میں بھی عزاداری امام حسینؑ کے باب کا اضافہ نہیں کیا گیا۔ مقدمہ میں چوتھی فصل میں امامت پر بیان ہے۔ اس میں بھی عزاداری امام حسینؑ یا نذر و نیاز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ اعمال شب عاشورہ سے لے کر آخر روز عاشورہ تک صرف پانچ گھنٹے میں ختم ہوجاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عزاداری امام حسینؑ کا جو سلسلہ پہلی محرم سے بارہ محرم تک ہوتا ہے یہ کس کی دین ہے؟ اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ اس کے بانی صوفیاء تھے اور اس کا ماخذ صوفیاء اور ان کی نسلوں کے سینے تھے جہاں عزاداری امام حسینؑ کی رسومات محفوظ تھیں جو نسل بعد نسل ایک کے بعد ایک دوسرے کو منتقل ہوتی رہیں۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ عزاداری امام حسینؑ کی کچھ رسومات پر علماء کو اعتراض بھی ہے۔ اس دور میں عزاداری امام حسینؑ پہلی محرم سے بارہ محرم تک اور صرف بیس صفر کو چہلم شہدائے کربلا ہوتا تھا۔ عزاداری کو آٹھ ربیع الاول تک جاری رکھنا ۱۸ ویں صدی کا اضافہ ہے۔

مجالس کس طرح منعقد کریں، تعزیہ کس طرح بنائیں، علم کس طرح کا ہو وغیرہ وغیرہ یہ سب زبانی تھا۔ ۱۲ اپریل ۹۸ء کو اپنے دوست ڈاکٹر نسیم اختر، جناب حسیب احمد اور جناب اقبال کے ہمراہ درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی [۳] زیارت کے واسطے گیا۔ دیکھا کہ درگاہ کے ایک گنبد پر ایک علم

۱- حسن علی کربلائی، تحفۃ العوام، یہ سال بھر کے اعمال پر مشتمل کتاب ہے۔ کوئی گھر اہل تشیع کا شاید ہی ایسا ہو کہ جس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔
۲- عزاداری امام حسینؑ سے متعلق اس میں کوئی باب نہیں اور نہ ہی عزاداری امام حسینؑ سے متعلق رسومات کا اس میں کہیں ذکر ہے۔
۳- حضرت قطب الدین بختیار کاکی کا تعلق صوفیاء کے چشتی سلسلے سے تھا۔ وہ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت معین الدین چشتی کے خلیفہ تھے۔ ان کی درگاہ دہلی میں مہرولی میں قطب مینار کے نزدیک واقع ہے۔

میر سید علی ہمدانی کے بزرگوں میں سے میر کمال الدین ہمدانی، مغل بادشاہ ہمایوں کے عہد میں سولھویں صدی عیسوی میں کشمیر سے جلالی تشریف
لے

نصب ہے۔ یہ علم بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ دس محرم کو جلالی کے بڑے امام باڑے میں سوار ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان علموں کا تعلق صوفی فکر سے ہے اس لیے کہ جلالی میں بھی عزاداری امام حسینؑ صوفیا ہی کی قائم کی ہوئی ہے۔ جلالی میں محرم کی مجالس میں سب سے پہلے دہ مجلس خوانی ہوتی ہے جو آج تک جاری ہے۔[۱] اس دہ مجلس میں پہلی مجلس حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور باقی دوسری مجالس اہل بیت اور شہدائے کربلا سے متعلق ہیں۔ ان میں ان حضرات کے فضائل و مصائب بیان کیے جاتے ہیں۔

صوفیاء نے ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کے نظام کو اس طرح ترتیب دیا کہ فن کار، کاریگر اور مزدور کو نظام عزاداری میں اس کے ہنر کے ساتھ جوڑ دیا۔ حلوائی، بڑھئی، ہتھیلیا، درزی، کارچوبی والے، ڈھول تاشے والے، میراثی، تیلی، کہار، سقے، فقراء، مالی، نان بائی اور مجاور وغیرہ۔ اگر ایک کاریگر یا مزدور کو عزاداری امام حسینؑ کا فلسفہ سمجھایا جاتا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ اسی لیے ان کو ان کے فن کے ساتھ عزاداری امام حسینؑ سے جوڑ دیا تاکہ وہ ان کی زندگی اور فکر کا حصہ بن جائے اور اس کے ہاں عزاداری امام حسینؑ سے دلی لگاؤ پیدا ہو جائے اور اس مشن میں صوفیاء کامیاب ہو گئے۔ ماہرین تعلیم نے تعلیم کو حرفے سے جوڑنے کا سبق تو بیسویں صدی میں دیا۔[۲] صوفیا نے ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کو حرفے سے جوڑنے کا کام ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ہی کامیابی کے ساتھ انجام دے دیا تھا۔ اور یہ ان کی بین کرامت تھی۔

عزاداری امام حسینؑ کے مرکز کا نام امام باڑہ رکھا گیا۔ یہ قطعی طور پر ہندوستانی اس طرح تھا کہ اس سے پہلے عرب، ایران اور دوسرے مسلم ممالک میں اس نام کا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ اس میں امام

⇨

لائے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ ساداتِ جلالی انہی کی نسل سے ہیں۔ جلالی میں عزاداری امام حسینؑ کا قیام اسی دور میں وجود میں آیا۔ نواب شجاع الدولہ نے اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ سید شاہ خیرات علی کو عزاداری امام حسینؑ کے مصارف کے لیے پانچ گاؤں ضلع ایٹہ میں دیئے۔ جلالی کی عزاداری میں جن چیزوں میں صوفیاء کی جھلک ملتی ہے وہ ہیں امام باڑے، مجلس خوانی، ہندو اور مسلمانوں کا عزاداری امام حسینؑ میں شریک ہونا۔ جلالی میں عزائے حسینؑ کو لے کر آج تک کوئی جھگڑا نہیں ہوا جبکہ جلالی سے انیس کلومیٹر دوری پر علی گڑھ میں اکثر عزائے حسینؑ کو لے کر مسئلہ بنا۔ جلوس پر پابندی لگی اور کچھ برسوں تک جلوس نہ نکل سکا۔

۱- بیسویں صدی میں جرمنی کے ماہر تعلیم کرشن نیر نے تعلیم کو حرفے سے جوڑنے کی سب سے پہلے تھیوری پیش کی۔ ہندوستان میں گاندھی جی نے آزادی کی تحریک میں بھی اس کا استعمال کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کو بنیادی تعلیم کے نصاب میں شامل کر کے قومی تعلیم کا ایک منصوبہ ۱۹۳۷ء میں وارد ھا میں پیش کیا۔

۲- درگاہ علی خاں، مرقعہ دہلی، فارسی مخطوطہ، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد، ایف۔اے۔بی ۸، ۵۶، ۵۷ اور ۵۸

کے ساتھ ایک ہندی لفظ باڑہ ملا کر امام باڑہ بنادیا تا کہ اس سے اس کا ہندوستانی مزاج جھلکے۔ اس کا نام اس زبان میں نہیں رکھا گیا کہ جس میں قرآن نازل ہوا یا جس زبان کو امام حسینؑ بولتے تھے۔ نہ فارسی کا کوئی نام رکھا۔ جب کہ یہی دو زبانیں مذہب اسلام اور اسلامی ثقافت سے قریب تر تھیں۔ یہ صوفیائے کرام کی فکر کا نفسیاتی پہلو تھا۔ اگر باہر کے ناموں اور زبان سے ہندوستان میں کوئی مرکز بنایا جائے گا تو اس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں گہری نہ ہوسکیں گی۔ امام باڑے کے دروازے بھی بلا تفریق مذہب و ملت سب کے لیے کھول دیئے گئے۔ یہ ہندوستان میں ایک نیا تجربہ تھا۔ نیچی ذات کے ہندو اگر چہ اپنے مندروں میں نہیں جاسکتے تھے لیکن وہ امام باڑوں میں ہونے والی عزاداری حسینؑ میں شرکت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ عزاداری حسینؑ ان کی زندگی کا جزو بن گئی۔ اور اس طرح ہندوستان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ عزاداری امام حسینؑ میں شرکت کے لیے تبدیلی مذہب کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ دس محرم کو ہندو بھی تعزیوں کی زیارت کرتے اور کربلا کے پیاسے شہیدوں کی یاد میں اپنے محلوں میں شربت کی سبیل لگاتے۔ لوگ اس تبرک کو پیتے وقت من ہی من میں گنگناتے:

بھارت میں اگر آ جاتا　　یوں پیاسا نہ مارا جاتا

مرقعہ دہلی میں ۱۷۷۱ء سے متعلق ایک بیان ملتا ہے کہ: ''درگاہ شاہ مرداں میں بارہ محرم کو ایک مجلس عزا ہوتی ہے۔ دہلی کا کوئی شخص ایسا نہ ہوتا جو اس میں شرکت نہ کرتا ہو۔ تا حد نگاہ سواریاں ہی سواریاں نظر آتیں۔ مالدار، غریب، چھوٹے بڑے غرض کہ سب لوگ ہی شرکت کے لیے یہاں آتے''۔ ۱۷۷۱ء کا یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس وقت تک عزاداری امام حسینؑ میں دہلی کے تمام لوگ یعنی ہندو اور مسلمان شرکت کرتے۔[۱]

تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں عیسوی تک عزاداری امام حسینؑ امام باڑوں میں ہوتی اور جلوس کا کوئی رواج نہ تھا۔ اس دور میں کچھ سلاطین کے دور میں عزاداری امام حسینؑ خفیہ طور پر ہوئی، اس لیے کہ خود صوفی تحریک کا قیام مسلمانوں میں موروثی ملوکیت کے خلاف احتجاج کی وجہ سے ہوا جس کے بانی حضرت معاویہ تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید مولانا ضیاء الدین برنی اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں لکھتے ہیں کہ: ''حضرت معاویہ اور امیرالمؤمنین عثمانؓ کے دوسرے

۱۔ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، لاہور ۱۹۸۳ء، ص ۴۶

عزیزوں نے جو اپنے حصہ مملکت میں وسیع علاقوں کے مالک تھے اور قوت اور اقتدار حاصل کر چکے تھے علی مرتضی کرم اللہ وجہہ الکریم کے خلاف بغاوت و سرکشی کی، ان سے بیعت نہیں کی اور فساد شروع کر دیا''۔[۱] امام حسینؑ نے اسی موروثی ملوکیت کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجے میں ان کی شہادت واقع ہوئی۔ عجیب سانحہ ہے کہ جس اسلامی سیاسی نظام کی بنیاد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ڈالی تھی اور جس کی پیروی خلفائے راشدین نے کی وہ تو ۶۶۱ء میں ختم ہوگیا لیکن جس موروثی ملوکیت کی بنیاد معاویہ نے ۶۶۱ء میں ڈالی وہ آج تک مسلم ممالک میں قائم ہے۔ سلاطین دہلی بھی بغداد کے موروثی ملوک ہی کی سرپرستی میں ہندوستان میں سلطان کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حکومت میں اعلانیہ طور پر عزاداری امام حسینؑ ممکن نہ تھی۔ اس لیے کہ حسینؑ کا نام ہی موروثی ملوکیت کے خلاف احتجاج تھا۔ محمد بن تغلق ابن تیمیہ کی فکر سے متاثر تھا۔ اس نے صوفی تحریک اور صوفیاء کے خلاف سخت اقدامات کیے اور اس طرح اس عہد کے مختلف ادوار میں صوفیاء سلطان کے عتاب کا شکار ہوئے۔ خلافت و ملوکیت کے مسئلے پر مولانا ابوالاعلی مودودی نے سیر حاصل بحث اسی عنوان پر اپنی کتاب میں کی ہے۔[۲]

عزاداری امام حسینؑ ایک مکمل ادارہ ہے جس کی باقاعدہ اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات نہ تو کسی عربی، فارسی یا اردو کی ڈکشنری میں ملیں گی اور نہ ہی شیعہ علماء کی کتابوں میں۔ عزاداری امام حسینؑ سے متعلق اصطلاحات صوفیاء ہی کی دین ہیں۔ نذر و نیاز، علم سے متعلق دو صورتیں ہیں، علم نصب کرنا اور علم سوار کرنا۔ یہ دونوں قطعی طور پر علیحدہ علیحدہ صورتیں ہیں اور انہیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس نے عزاداری کے نظام کو بچپن سے دیکھا ہے، سمجھا ہے اور اس پر عمل کیا ہے۔ ان اصطلاحات کا استعمال اردو مرثیہ گو شعراء میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی میں ہوا ہے اور وہ اس لیے کہ یہ مرثیہ گو شعراء تصوف سے حد درجہ متاثر تھے۔ میر انیس کے مورث سید محمد گیسودراز بندہ نواز تھے۔

عزاداری حسینؑ کا دوسرا دور سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے جب مغل بادشاہ ہندوستان آئے اور اپنی حکومت قائم کی۔ مغل بادشاہوں کو اہل بیت سے عقیدت تھی اسی لیے انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر کوئی پابندی نہیں لگائی لیکن تورانی علماء اور امراء کو اہل بیت سے ایسی کوئی خاص عقیدت نہ تھی اسی لیے بعض معاملات میں انہوں نے سختی رکھی۔ لیکن ہمایوں کی ایران سے واپسی پر

۱- سید ابوالاعلی مودودی، خلافت و ملوکیت، دہلی ۲- اقتدار عالم خاں، امرائے عہد اکبر اور اس کی مذہبی پالیسی کا ارتقاء، ص ۳۲-۳۶

ایرانی علماء اور امراء کا ہندوستان آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اکبر کے عہد کے پہلے دور میں یعنی ۱۵۵۶ء سے ۱۵۸۰ء تک ایرانی علماء، امراء اور تورانی علماء اور امراء میں درباری سیاست اور مذہبی عقائد کو لے کر کش مکش شروع ہوگئی۔ اکبر خود مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی جیسے علماء کے زیر اثر رہا۔[۱] ان کے علاوہ بھی اکبر کے عہد میں دوسرے ایسے عناصر موجود تھے جو چشتی اور سہروردی صوفیاء کی ترکیبی حکمت عملی کے مخالف تھے۔ خود شیخ احمد نقشبندی سرہندی نہ صرف بین المذاہبی رواداری کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک غیر سنی مسلمان بھی کافروں کی حیثیت رکھتے تھے۔[۲] اکبر نے ایسے عناصر کی پرواہ کیے بغیر ۱۶۸۰ء میں ہندوستان میں صلح کل کی پالیسی کی بنیاد ڈالی اور تمام مذاہب کے لوگوں کو مذہبی آزادی دی۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کا اثر عزاداری امام حسینؑ کی نشر و اشاعت کے لیے مددگار ثابت ہوا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک ایرانی شیعہ عالم سید نوراللہ شوشتری کو لاہور کا قاضی بنایا گیا۔[۳] ایسی حکومت میں جہاں حنفی فقہ کی پیروی ہوتی تھی، اس دور میں عزاداری امام حسینؑ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں بھی یہ آزادی رہی۔ جب اورنگزیب بادشاہ بنا تو اس کا رجحان مذہب کی طرف اپنے اجداد سے زیادہ تھا۔ اورنگزیب کو اہل بیت سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے رقعات اور احکامات اس کے رجحان کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں۔ اورنگزیب نے اپنے وصیت نامے میں تحریر کیا ہے کہ 'لازم السعادات' سادات بارہہ کے ساتھ احترام و رعایت میں کوئی فروگذاشت نہیں کرنی چاہیے اور قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی کی آیت شریفہ کے بموجب عمل کرنا چاہئے کیوں کہ آیت کریمہ: ''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ میرے عزیزوں سے محبت کرو'' کے مطابق یہ جماعت اجر نبوت ہے۔ اس میں ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہئے کہ دنیا و آخرت میں خیر و فلاح کا باعث ہے۔[۴] یہ وصیت نامہ بارہ نکات پر مشتمل ہے۔ اس کے متعلق اورنگزیب نے لکھا ہے کہ: ''اثنا عشر کا عدد مبارک ہے اور وصیت کا اختتام بھی اثنا عشر پر کیا جاتا ہے''۔[۵] ایک اور رقعے میں لکھتا ہے کہ: ''سادات سے محبت اور عزت کرنا ہمارے مذہب کا حصہ ہے اور ان سے نفرت اور دشمنی رکھنے والے کے لیے جہنم ہے''۔[۶] اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب اورنگزیب کا سادات کے بارے میں یہ

۱- قاضی جاوید، ہندی مسلم تہذیب، لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۲۴ ۲- عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد سوم، ص ۳۸-۱۳۷
۳- سید محمد عزیز الدین حسین، قاضی نور اللہ شوشتری بیک سوانحی خاکہ، اسلام ان دی ماڈرن ورلڈ، جلد ۲، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱-۲۹
۴- اورنگزیب، احکام عالمگیری، لاہور ۱۹۹۳ء، ص ۳۶-۱۳۴ ۵- ایضاً، ص ۱۳۴ ۶- ایضاً، ص ۱۳۵

عقیدہ ہے تو اہل بیت سے اسے کس درجہ مودت ہوگی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مغل دور میں اس کے خلاف بھی ذہن موجود تھے۔ صادق خاں، طبقات عالمگیری میں عہد اورنگزیب کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ جب گول کنڈہ کا محاصرہ چل رہا تھا تو کچھ لوگوں نے صف شکن خاں تورانی سے جو کہ کمانڈر تھا کہا کہ قلعہ تو فتح ہو ہی جائے گا وہاں غذا اور پانی جانے میں زیادہ سختی نہ کریں اس لیے کہ قلعے کے اندر علماء اور سادات صحیح النسب بھی موجود ہیں۔ صف شکن خاں نے جواب دیا کہ: ''اگر امام حسینؑ بھی اس قلعے میں موجود ہوتے تو بھی سختی میں کوئی کمی نہ کرتا''۔[۱] جب اس واقعے کی اطلاع اورنگزیب کو ہوئی تو اس نے اس کو اس کے منصب سے برطرف کر کے جیل خانے میں ڈلوادیا۔ فرزند علی مونگیری ملخص التواریخ میں عہد اورنگزیب کا ہی واقعہ لکھتے ہیں کہ: ''میر جملہ عظیم آباد بہار کے گورنر بن کر گئے تو امراء ان کے پاس حاضری کے لیے آئے لیکن نعمت اللہ خاں ایام عاشورہ میں عزاداری امام حسینؑ میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان ایام کے بعد حاضر ہوئے۔ اس وقت محمد امین خاں بھی موجود تھے۔ میر جملہ نے کہا کہ آپ اتنے روز بعد کیوں آئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ماتم داری میں مشغول تھا اس لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ محمد امین خاں نے کہا کیا آپ کے گھر کسی کی موت ہوگئی تھی۔ نعمت اللہ خاں نے کہا کہ شہادت حسینؑ واقع ہوئی ہے۔ محمد امین خاں نے کہا کہ اس کے کیا معنی، یزید اور حسینؑ تو ایک دوسرے کے بھائی تھے۔ عجیب بات ہے کہ آپ ایک بھائی کا تو ماتم کریں اور دوسرے کی خوشی میں شامل نہ ہوں۔ نعمت اللہ خاں نے جواب دیا کہ جن سے ہمارا تعلق ہے انہیں شہید کر دیا گیا اس لیے ہم ماتم کرتے ہیں۔ آپ کے بھائی کو فتح حاصل ہوئی آپ خوشیاں منایئے''۔[۲]

عہد اورنگزیب کے اختتام سے پہلے ہی کشیدگی اور حالات خراب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وحدت الوجودی رویّے نے مذہبی امتیازات کو ختم کرنے کی ترغیب دی۔ وحدت الشہودی رویّے نے تقسیم کو ہی اپنا نصب العین قرار دیا اور بالآخر اہل اسلام کے مختلف فرقوں میں بھی اتحاد و ابلاغ کے تمام وسیلے تباہ کر دیئے گئے۔ شیخ احمد سرہندی کے صاحبزادے شیخ محمد معصوم نقشبندی نے عالمگیر کو شیعوں کا قتل عام کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھا کہ: ''ابن عباس نے روایت کی کہ آخری زمانے میں ایسے لوگ

۱۔ محمد صادق، طبقات عالمگیری، مخطوطہ، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، الیف ۸۵ الیف

۲۔ فرزند علی مونگیری، ملخص التواریخ، مخطوطہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی، الیف ۱۳۸ اے

ہوں گے جن کو روافض کہیں گے۔ یہ اسلام کی توہین کرنے والے اور مشرک ہونگے، ان کو قتل کر دینا"۔[1] اورنگزیب اس حد تک تو نہ جاسکا تاہم اس کے زمانے میں کچھ معاشی بحران کی بنا پر درباری سیاست اور کچھ مذہبی بنیادوں پر شیعہ سنی اختلافات نے خراب صورت اختیار کرلی۔ خود اورنگزیب کی تحلیلی حکمت عملی کا نتیجہ صرف یہ نہیں تھا کہ مغل حکومت کی غیر مسلم اکثریت مغائرت کا شکار ہوگئی اور اس کے مراکز تبدیل ہوگئے بلکہ خود مسلمانوں میں بھی فرقہ وارانہ رجحانات شدت اختیار کر گئے۔ امت کا اتحاد ختم ہونا شروع ہوگیا۔ ان تمام حالات کا اثر عزاداری امام حسینؑ پر پڑنا شروع ہوا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ اول کے دور میں شیعہ سنی تنازعات نے فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کرلی۔[2] اکبر نے اسلام کو انسان دوستی کے مساوی قرار دیا تھا اور اس سے نسل انسانی کی اجتماعی فلاح مراد لی تھی لیکن اٹھارویں صدی کے مغل ہندوستان میں اسلام کی وسیع تر توجیہہ کو نہ صرف مسترد کردیا گیا بلکہ نظری اور عملی دونوں سطحوں پر اسلام کو ایک فرقے کے عقائد میں ضم کردیا گیا۔

مغل حکومت زوال پذیر ہوئی اور علاقائی حکومتوں کا وجود عمل میں آیا۔ اودھ میں نواب شجاع الدولہ کا عروج ہوا۔ انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر خاص توجہ دی۔ امام باڑوں کو معافیاں دیں تاکہ لوگ عزاداری امام حسینؑ پورے اطمینان و انہماک سے انجام دیں۔ ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ نے عزاداری محرم قصبہ جلالی، ضلع علی گڑھ میں کی اور نواب آصف الدولہ نے ۱۷۸۷ء میں سید شاہ خیرات علی کے امام باڑے کے لیے پانچ گاؤں دیئے جن کو انگریزوں نے ۱۸۰۴ء میں ضبط کرلیا۔ اس طرح نوابان اودھ نے کثیر تعداد میں عزاداری حسینؑ کے فروغ کے لیے معافیاں دیں۔ اسی وجہ سے بعض علماء اور دانشوروں کا خیال ہے کہ نوابان اودھ کے عہد میں عزاداری امام حسینؑ کو عروج حاصل ہوا۔ لیکن میری رائے اس سے مختلف ہے اس لیے کہ اٹھارویں صدی میں ہی عزاداری امام حسینؑ انحطاط کی طرف مائل ہوگئی۔ اگر ہم عزاداری امام حسینؑ کا جائزہ پورے شمالی ہندوستان میں لیں تو اب مسلمانوں میں اتحاد کی جگہ فرقہ واریت نے لے لی تھی اور عزاداری امام حسینؑ کی وسعت ختم ہو رہی تھی۔ محرم میں سنیوں کے جلوس علیحدہ اور شیعوں کے جلوس علیحدہ نکلنا شروع ہوگئے۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی جس کی وجہ کچھ تو ان سے علیحدگی اور کچھ یہ تھی کہ ان کے یہاں خود اصلاحی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ فرقہ پرست دانشور اس مسئلے پر ایرانی، تورانی

۱۔ قاضی جاوید، ص ۲۴۰ ۲۔ ایضاً، ص ۲۴۱

حوالوں سے بحث کرتے تھے جس کے نتیجے میں شیعہ سنی اختلافات شدت اختیار کر رہے تھے۔

اسی دور میں شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کے لیے تحریک شروع کی۔ شاہ ولی اللہ کا بھی نسب والدہ کی جانب سے امام موسیٰ کاظم تک پہونچتا ہے۔[۱] شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے اس تورانی تصور کی تردید کی کہ شیعہ مشرک ہیں لہٰذا واجب القتل ہیں۔[۲] اس دور میں نہ صرف فرقہ واریت پیدا ہو چکی تھی بلکہ لسانی عصبیت بھی اس حد تک پیدا ہو چکی تھی کہ جس وقت شاہ ولی اللہ قرآن کے فارسی ترجمے میں مشغول تھے تو کچھ علماء ان کے مخالف ہو گئے اور ترجمے کو بدعت قرار دیا۔ ایک دفعہ وہ مسجد فتح پوری میں نماز کے لیے گئے تو مسلمان ایک کثیر تعداد میں وہاں جمع ہو گئے اور ان کی جان کو خطرہ ہو گیا۔[۳] بقول شاہ عبدالعزیز: ''ایک شخص نے والد ماجد سے شیعوں کے کافر ہونے کے متعلق فتویٰ پوچھا۔ آپ نے کہا کہ علمائے حنفیہ میں اس پر اختلاف ہے۔ جب دوسری مرتبہ یہی سوال ہوا اور یہی جواب ملا تو اس شخص نے کہا کہ یہ شخص شیعہ ہے''۔[۴] جہاں تک محبت اہل بیت کا تعلق ہے تو شاہ ولی اللہ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ: ''میری طبیعت اور میری فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فضیلت دیں''۔[۵] ان حالات سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دور میں عزاداری امام حسینؑ بھی متاثر ہوئی ہوگی۔

شاہ عبدالعزیز نے سیر الشہادتین لکھی۔ اس کتاب کی بنیاد پر بعض لوگ شاہ عبدالعزیز کو شیعہ تصور کرتے تھے۔[۶] ملفوظات کے مطابق: ''حافظ آفتاب میرے درس میں شامل ہوتے تھے ایک روز حضرت علی کا ذکر شروع ہوا۔ (میں نے) حضرت علیؑ کے مناقب بیان کرنے شروع کر دیئے۔ اس روہیلہ پٹھان نے شیعہ سمجھ کر درس میں آنا موقوف کر دیا''۔[۷] اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے ۹۰-۱۷۸۹ء میں تحفہ اثنا عشریہ لکھی جو شیعی عقائد کے رد میں تھی۔ اس کے دیباچے میں شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ: ''اس کتاب کی تالیف کی غرض اور ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اور جس زمانے میں ہم زندگی گذار رہے ہیں اس میں اثنا عشریہ کا غلبہ اور شہرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ بہ مشکل کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں کوئی نہ کوئی شخص یہ مذہب اختیار نہ کر چکا ہو یا اس سے متاثر نہ ہوا ہو''۔[۸]

۱- شیخ محمد اکرام، رود کوثر، لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۵۳۴ ۲- قاضی جاوید، ص ۲۴۱ ۳- ایضاً، ص ۲۴۳ ۴- ایضاً، ص ۲۴۲
۵- شیخ محمد اکرام، ص ۵۷۵ ۶- ڈاکٹر ثریا ڈار، شاہ عبدالعزیز اور ان کی علمی خدمات، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۴ ۷- ایضاً
۸- شاہ عبدالعزیز، تحفہ اثنا عشریہ، ص ۴، ۳

شاہ عبدالعزیز کا یہ جملہ دعوت فکر دیتا ہے کہ آخر ایسے کون سے محرکات تھے کہ جن کی وجہ سے شیعی عقائد کو اس درجہ فروغ حاصل ہوا۔ اس لیے کہ جس دور کی بات شاہ عبدالعزیز کررہے ہیں اس میں شیعہ مجتہدین کا وجود بھی نہ تھا۔ دراصل ان عقائد کی تبلیغ صوفیائے کرام نے کی تھی اور وہ یہی کہ محبت اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کے ساتھ واقعات ان کے مذہبی رجحانات اور مناقب حضرت علیؑ بیان کرنے کے سلسلے میں پیش آئے۔صوفیاء نے جس اسلام کی تبلیغ کی وہ قرآن، سنت نبویؐ اور محبت اہل بیت پر مبنی تھا۔ اسی کی تبلیغ حضرت معین الدین چشتی، حضرت بہاء الدین سہروردی، حضرت نظام الدین اولیا، میر سید علی ہمدانی، سید شرف الدین شاہ ولایت، سید شاہ اشرف، سید جہانگیر سمنانی، سید محمد گیسو دراز اور دوسرے صوفیائے کرام نے کی تھی۔ یہ شیعہ مجتہدین وعلماء کا کارنامہ نہیں اس لیے کہ یہ ان کے وجود سے بہت پہلے کی بات ہے۔

تحفہ اثناعشریہ کے جواب میں حکیم مرزا محمد کامل، شہید رابع نے نزہۃ اثناعشریہ لکھی اور مولوی سید دلدار علی شیعہ مجتہد اول نے ذوالفقار لکھی۔بس اب کیا تھا کہ مناظرے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس مناظرے نے بھی عزاداری امام حسینؑ کو نقصان پہونچایا۔ حالات کو مزید سنگین بنانے کے لیے کچھ من گھڑت روایات لکھی گئیں تاکہ شیعہ سنی اختلافات میں مزید اضافہ ہو اور شدت اختیار کریں۔ امیر شاہ خاں امیرالروایات میں شاہ عبدالعزیز کے متعلق اس طرح روایت بیان کرتے ہیں کہ: ''اس زمانے میں روافض کا نہایت غلبہ تھا۔ چنانچہ دہلی میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا کر انہیں بے کار کردیا تھا تاکہ وہ کوئی کتاب نہ لکھ سکیں۔ شاہ عبدالعزیز کو دہلی سے نکلوادیا تھا۔شاہ عبدالعزیز جونپور پیدل گئے کیونکہ ان کو سوار ہونے کا حکم نہ تھا''۔[1] اس روایت کو اکابر سنی علماء مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد میاں اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے شاہ عبدالعزیز کی سوانح کے تحت اپنی کتابوں میں بھی نقل کیا ہے۔[2] دہلی پر نجف خان کا اقتدار ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۲ء تک رہا۔ شاہ ولی اللہ کا انتقال ۱۷۶۲ء میں ہو چکا تھا۔[3] دوسرے یہ کہ پہنچے اتروانے کا ذکر شاہ ولی اللہ کے کسی معاصر نے نہیں کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے تحفہ اثنا عشریہ ۹۰-۱۷۸۹ء میں تصنیف کی جب کہ نجف خاں کا انتقال ۱۷۸۲ء میں ہو چکا تھا۔[4] شاہ عبدالعزیز کے پیدل جونپور جانے کا تذکرہ بھی ان کے کسی اور معاصر نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جب لوگوں نے اس طرح کی روایات ان علماء کے بارے میں پڑھی

۱- ڈاکٹر ثریا ڈار، ص ۱۳۲ ۲- ایضاً، ص ۱۳۲ ۳- ایضاً، ص ۱۳۲ ۴- ایضاً، ص ۱۳۲

ہونگی تو ان کی نفرت میں مزید اضافہ ہوا ہوگا جب کہ یہ روایات تاریخی شواہد کی روشنی میں قطعی بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں۔

فارسی ادب میں تو اہل بیت سے عقیدت بہت صاف صاف جھلکتی ہے۔ لیکن اس دور کے اردو ادب میں بھی اہل بیت نبیؐ سے عقیدت حد درجہ نظر آتی ہے۔ میر جعفرزٹلی حضرت علیؑ سے عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

کیوں نہ جعفر ہو ثنا خوان شہہ خیبر کا　　صدق باطن سے ہوا خاک وہ در خیبر کا
ہے نہ وسواس اسے بھوت و سیہ اژدر کا　　روز و شب یاد رکھے نام علیؑ حیدر کا

میر تقی میر ان الفاظ میں مدح سرائی کرتے ہیں:

ہادی علیؑ، رفیق علیؑ، رہنما علیؑ　　یاور علیؑ، محمد علیؑ، آشنا علیؑ
مرشد علیؑ، کفیل علیؑ، پیشوا علیؑ　　مقصد علیؑ، مراد علیؑ، مدعا علیؑ

مرزا غالب اپنے کلام میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

ارزندہ گوہری چون من اندر زمانہ نیست　　خود را بہ خاکِ رہگذرِ حیدر افگنم

ساغر پی صبوح لبالب کنم ز می　　چونان کہ لب ز زمزمۂ یا ابوالحسن
چو برگ گل ز باد سحرگاہی ام زبان　　رقصد بنامِ حیدرِ کرّار در دہن

چھنو لال دلگیر نے مراثی لکھے۔ ایک مرثیے کا مطلع ہے:

پہونچے امیر شام کی مجلس میں جب اسیر

اس مرثیے میں ان حالات کی بڑے دل سوز انداز میں عکاسی کی ہے جو اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس لٹے ہوئے قافلے کی پیشی کے وقت یزید کے دربار میں پیش آئے۔

علامہ اقبال ٹوٹے ہوئے خانقاہی نظام میں دوبارہ زندگی بیدار کرنے کے لیے اس طرح ترغیب دیتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری

مولانا محمد علی ان الفاظ میں مسلمانوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے نعرہ بلند کرتے ہیں:

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک کتاب ''شہید کربلا'' لکھی۔ لیکن ان دونوں حضرات کے ہاں ایک مقام پر حد درجہ تضاد نظر آتا ہے۔ امام حسینؓ کا احتجاج اور اس کے نتیجے میں ان کی شہادت ملوکانہ موروثی نظام کے قیام کے خلاف تھی۔ یہ دونوں علماء یعنی مولانا محمد علی اور مولانا آزاد امام حسینؓ سے تو حد درجہ عقیدت رکھتے تھے لیکن ان دونوں حضرات نے غیر اسلامی ملوکانہ موروثی نظام کو نہ صرف خلافت کا نام دیا بلکہ اس کی حیات کو باقی رکھنے کے لیے ہندوستان میں خلافت تحریک چلائی۔ ان علماء کے یہ دونوں عمل قطعی طور پر متضاد تھے۔ مولانا شبلی نعمانی نے معرکۃ الآراء کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھی۔

اب برٹش راج کا ہندوستان پر پوری طرح تسلط ہوگیا۔ صوفی تحریک میں ضعف و اضمحلال کے آثار پہلے ہی نمایاں ہو چکے تھے۔ ہندو مسلم نفرت سترھویں صدی عیسوی کے اختتام سے شروع ہو چکی تھی۔ بقول سرسید احمد خاں: ''اس برادرانہ محبت سے جو آپس میں تھی ۱۷۷۹ء میں عالمگیر کے عہد میں یہ محبت ٹوٹ گئی اور بہ سبب مقابلہ سرکشی قوم ہنود شیواجی مرہٹہ وغیرہ کے عالمگیر جملہ قوم ہنود سے ناراض ہوا اور اپنے صوبہ داروں کے نام حکم بھیجے کہ جملہ قوم ہنود کے ساتھ سخت گیری سے پیش آئیں اور ہر ایک سے جزیہ لیں پھر جو نفرت اور ناراضی رعایا کو ہوئی وہ ظاہر ہے''۔ اب اس کو برٹش سرکار کی سرپرستی میں مزید تقویت ملنا شروع ہوئی۔ مسلمانوں کے درمیان شیعہ سنی اختلافات اپنے عروج پر پہونچ گئے۔ انگریز اپنی حکومت کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے ہندو مسلم نفرت اور شیعہ سنی اختلافات سے سیاسی فائدے اٹھانے کی ایک جامع اسکیم تیار کر چکے تھے۔ انہوں نے تاریخ سے متعلق مفسدانہ کتابیں لکھیں اور لکھوائیں اور ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو طالب علم ان کتابوں کو پڑھتے ان میں ہندو مسلمانوں، سنیوں اور شیعوں میں نفرت کا احساس پیدا ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ یہ زہر پورے سماج میں سرایت کر گیا۔

اس فرقہ پرستی نے ہندوستانی سیاست، سماج اور ثقافت کو مزید کمزور بنا دیا تھا۔ ہندوستانیوں کے سامنے ان مسائل کا کوئی حل نہ تھا اور نہ ہی ان کا کوئی راہبر یا رہنما تھا جو انہیں اس دلدل سے نکال کے لے جاتا۔ ان ابتر حالات کی وجہ سے عزاداری امام حسینؓ بھی متاثر ہوئی۔ صوفیاء نے اپنی کوشش سے یوم عاشورا کو ہندوستان میں تمام ہندوستانیوں کے لیے ایک غم کا دن بنا دیا تھا، اس دن ہر ہندو اور مسلمان اپنے کاروبار کو بند رکھتا اور امام حسینؓ کی شہادت کو یاد کرتا۔ لوگ تعزیوں کے جلوس نکالتے اور کربلا کے پیاسوں کی یاد میں شربت کی سبیلیں لگاتے۔ ابھی حال ہی میں انڈیا آفس لائبریری،

لندن میں ایک مخطوطہ مرآت الاحوال جہاں نما کے مطالعے کا موقع ملا۔ ۱۸۰۶ء کے حوالے سے جمشید پور کے متعلق لکھا ہے کہ: ''تمام ہندو اور مسلمان تعزیہ داری کرتے اور ایام عشرۂ محرم میں کوئی بھی شخص چاہے مالدار ہو یا غریب شہر کے اندر سواری پر نہیں چل سکتا تھا۔ اگر کوئی بھی شخص سواری پر غلطی سے بھی چلتا تو ہندو اور مسلمان دونوں مل کر اس کو ذلیل کرتے اور اس کو مجبور کر دیتے کہ وہ پیدل چل کر راستہ طے کرے''۔[۱] اب ایسا انقلاب آیا کہ اسی یوم عاشورا کو محرم کا جلوس ایک مسئلہ بن گیا۔ محرم کا جلوس لے کر ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ محرم کے جلوس کی بنا پر شیعہ سنی فسادات تک پہونچ گیا اور خود ہندوستان میں ہی عاشورہ پر کربلا جیسے واقعات پیش آنے لگے۔ جس طرح آج عراق میں ہورہا ہے۔ مدح صحابہ اور تبرّیٰ ایجی ٹیشن شروع ہوئے۔ ہزاروں سنی اور شیعہ جیل گئے اور اس طرح شیعوں اور سنیوں کے درمیان ایک خلیج قائم ہوگئی۔ تبرّیٰ ایجی ٹیشن کی حمایت سید علی ظہیر نے کی اور مدح صحابہ کا مسئلہ مولانا حسین احمد مدنی نے اٹھایا اور عجیب بات ہے کہ دونوں ایک ہی وقت میں یوپی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ اس سے نہ صرف عزاداری امام حسینؑ متاثر ہوئی بلکہ آزادی کی تحریک بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے بعد سنیوں کے تعزیوں کے جلوس علیٰحدہ اور شیعوں کے جلوس علیٰحدہ علیٰحدہ نکلنا شروع ہوگئے اور ہندوؤں نے تو اس سے کنارہ کشی ہی اختیار کرلی۔ کچھ مورخین اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہ اختلافات سترھویں صدی کے اختتام سے ہی شروع ہوگئے تھے البتہ انگریزوں کے آنے کے بعد ان کی پالیسیوں کے نتیجے میں مزید شدت اختیار کر گئے۔ صوفیاء نے ترکیبی حکمت عملی سے عزاداری امام حسینؑ کو وسعت دی تھی جس میں بلاتفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانی شریک ہوتے تھے۔ صوفی تحریک کمزور ہوئی، صوفیاء کے اثرات کم ہونا شروع ہوئے اور اب عزاداری امام حسینؑ علماء کے ہاتھوں میں پہنچی۔ علماء نے عزاداری امام حسینؑ کے سلسلے سے تحلیلی رویہ اپنایا جس کے نتیجے میں عزاداری امام حسینؑ محدود ہوتی چلی گئی۔ علماء نے ایک خاص تبدیلی اس نظام کے سلسلے میں یہ کی کہ عزاداری امام حسینؑ کے مرکز کے نام کو امام باڑے سے تبدیل کر کے امام بارگاہ اور حسینیہ کردیا۔ اس نام کی وسعت اور ہندوستانیت کو ختم کر کے عربیت اور فارسیت لاد دی۔ اور اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ایسا نہ تھا کہ صوفیاء عربی و فارسی نہ جانتے تھے۔ انہوں نے اس کا نام امام باڑہ بڑی غور وفکر کے بعد رکھا تھا۔

۱۔ مولانا محمد تقی، مرآت الاحوال جہاں نما، فارسی مخطوطہ، انڈیا آفس کلکشن، لندن، ایف ۱۱۸ اے

اورنگ زیب نے ۱۶۹۴ء میں علماء صوفیاء اور سادات کو دی ہوئی مدد معاش کو موروثی زمینداری میں بدل دیا تھا جس کے نتیجے میں علماء صوفیا اور سادات کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے زمیندار بن گئے تھے، اور آہستہ آہستہ اپنے مورثوں کے راستے چھوڑ کر زمیندارانہ اقدار کے حامل ہوگئے۔ برٹش راج میں بھی مسلمان زمیندار بنے اور خاص طور سے سادات، سادات امروہہ، سادات جلالی، سادات سرسی، سادات مظفرنگر سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر سادات کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے اجداد زمیندار تھے۔ خود میرے ہی مورث سید شاہ خیرات علی کو ان کے قائم کردہ امام باڑے کے لیے نواب شجاع الدولہ نے معافی دی جس کو بعد میں زمینداری کی حیثیت میں منتقل کردیا گیا۔ علماء نے اس زمیندارانہ نظام پر کچھ توجہ نہ دی اور انہوں نے بھی اپنے آپ کو اسی زمیندارانہ نظام میں ضم کرلیا۔ انہوں نے بھی نوابان اودھ سے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کیں، بغیر اس مسئلے پر غور کیے ہوئے کہ یہ نوابی اور زمینداری ملوکیت ہی کا ایک اہم جزو ہے اور خود ملوکیت ایک غیر اسلامی ادارہ ہے۔ علماء اور سادات کا زمیندار بننا اتباع اہل بیت نہ تھا۔ امام حسینؑ کا احتجاج اسی ملوکانہ موروثی نظام کے خلاف تھا اور اسی احتجاج کے نتیجے میں شہادت پائی۔ اس زمینداری کو اپنے خاندانوں میں محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے جو وقف نامے وقف علی الاولاد کیے ان میں پسر اکبر کو اسی بنا پر متولی بنایا اور باقی تمام بیٹوں کو ان کے شرعی حقوق سے محروم کردیا گیا اور اس طرح سے فقہ جعفری کی پیروی کے بجائے ملوکیت کے پیرو رہے۔ وقف فی سبیل اللہ جائدادوں کو آپس میں تقسیم کرلیا جب کہ وقف فی سبیل اللہ جائداد زمینداری کے تحت نہیں تھی اور اسی وجہ سے قابل تقسیم بھی نہ تھی۔ اس کے نتیجے میں بہت سے امام باڑے وقف فی سبیل اللہ جائدادوں سے محروم ہوگئے۔ سادات بھی مودۃ القربی کے پیرو تھے اور عزاداری امام حسینؑ ان کے عقیدے کا ایک اہم جزو تھی۔ انہوں نے بڑے عالی شان امام باڑے تعمیر کرائے اور ان میں بیلجیم کے جھاڑ فانوس آویزاں کیے اور بڑی شان سے عاشورۂ محرم کی عزاداری منعقد کی اور اس طرح سے آہستہ آہستہ صوفیاء کی قائم کی ہوئی خلوص نیت اور سادگی پر منحصر عزاداری امام حسینؑ کی معنویت کو سخت نقصان پہونچا۔ اس لیے کہ دونوں اداروں، عزاداری اور زمینداری کا مزاج ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھا بلکہ یہ دونوں ادارے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں شیعہ علماء و مجتہدین نے قوم کی سیاسی اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اٹھارہویں صدی سے لے کر موجودہ انقلاب ایران تک جو آیۃ اللہ خمینی علیہ الرحمہ

کی رہبری میں وجود میں آیا، ہندوستانی شیعہ علماء اور مجتہدین نے سیاسی اصلاح اور اس سے متعلق فکر پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک کتاب بھی نہیں لکھی۔ ان علماء اور مجتہدین نے اپنے آپ کو نوابوں اور زمینداروں سے ہی وابستہ رکھا اور اسی نظام کا حصہ بن گئے۔ سیاسی اصلاح ان کی تقاریر کا بھی موضوع نہیں رہی، بلکہ ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے زیادہ تر شیعہ علماء اور مجتہدین ایران کے پہلوی بادشاہوں سے ہی مرعوب رہے۔ یہ تو اب ایران کے انقلاب کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی شیعہ علماء نے اسلامی جمہوریہ کی بات کرنی شروع کی ہے۔ بچپن میں مجالس میں میرے کان اس اصطلاح سے قطعی نا آشنا رہے۔ میں نے تو اپنے وطن جلالی میں کبھی کسی عالم دین کو اس موضوع پر تقریر کرتے نہیں سنا۔ بالکل ایسی ہی حالت اہل سنت کی بھی ہے کہ ان کی بھی ایک کثیر تعداد سعودی عرب کے موروثی شاہوں سے متاثر ہے۔ ہاں اس دور میں اس مسئلے پر ایک سنی عالم مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے قلم اٹھایا اور خلافت وملوکیت نام کی کتاب لکھی۔ میں اس کو ان کا ایک بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں۔

صوفیاء نے امام باڑوں کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت سب کے لیے کھول دیئے تھے اور ایک کثیر تعداد مجالس ایام عاشورۂ محرم میں شریک ہوتی۔ اب حسینیہ اور امام بارگاہ کے دروازے بھی سب کے لیے کھلے رہیں لیکن ہندوؤں اور سنیوں نے ان مجالس میں شرکت کرنی قطعاً بند کردی۔ یہاں یہ بات واضح کرنا چاہوں گا کہ امام باڑے کے نام کو بڑے شہروں میں حسینیہ اور امام بارگاہ کردیا گیا، جیسے لکھنؤ میں امام باڑہ غفران مآب کو اب زیادہ تر حسینیہ غفران مآب لکھا جانے لگا ہے یا پاکستان میں کراچی جیسے شہر میں امام باڑے امام بارگاہ کہلانے لگے لیکن ان قصبات میں جن کے مورث اعلی صوفیائے کرام تھے اور انہوں نے ہی وہاں بنائے عزاداری محرم ڈالی تھی، وہاں آج بھی ان کا نام امام باڑہ ہی ہے۔ خود میرے وطن جلالی میں کسی امام باڑے کو حسینیہ یا امام بارگاہ آج تک نہ تو کہا گیا اور نہ لکھا گیا۔ دوسرے ان قصبات میں عزاداری امام حسینؑ کو لے کر کسی بھی دور میں ہندو، مسلم یا شیعہ سنی فساد نہیں ہوا۔ زمینداروں کے امام باڑوں میں سفید چاندنی کا فرش ہوتا۔ اشراف اس فرش پر بیٹھتے اور دیلی پر دری کا فرش ہوتا جس پر مزدور وغیرہ بیٹھتے جو ان امام باڑوں میں نیازؑ کے نواسے کا پرسہ دینے کے لیے آتے تھے۔ صوفیاء نے ان مجالس کی بنیاد اسلامی مساوات و اخوت پر قائم کی تھی۔ اب تفریق پیدا کردی گئی۔ صوفیا عزائے حسینؑ کے ذریعے تبلیغ اسلام کررہے تھے اس لیے کہ اس ملوکانہ نظام نے مسلمانوں میں مساوات کو ختم کردیا تھا۔ مساوات صرف مساجد تک محدود ہوکر

رہ گئی تھی۔ بقول اقبال:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

محمود غزنوی اور اس کا غلام ایاز صرف نماز کے وقت برابر اور باقی زندگی میں وہ بندہ اور محمود بندہ نواز تھے۔ وہاں مساوات نہ تھی۔ صوفیاء ان خانقاہوں اور امام باڑوں میں لوگوں کو ایک جگہ بٹھا کر مسلمانوں میں تفریق کو ختم کر کے اسلامی مساوات کی جڑوں کو مضبوط کر رہے تھے جس کو مسلمانوں کے موروثی ملوکانہ نظام نے ختم کر دیا تھا۔

عزاداری امام حسینؑ نے ایک موڑ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند اور خاتمۂ زمینداری کے بعد لیا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ شیعہ علماء نے سیاسی رہنمائی یا اصلاح کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ علمائے دیوبند نے تو قیام پاکستان کی ببانگ دہل مخالفت کی لیکن شیعہ علماء خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ اب کیا کرنا ہے؟ کس طرف جانا ہے؟ علماء و مجتہدین کی طرف سے کوئی رہ نمائی نہیں، نتیجتاً شیعہ فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان چلی گئی اور آج وہ اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ ہندوستان جیسے جمہوری ملک کو چھوڑ کر جانا صحیح فیصلہ نہ تھا۔ ان تمام حالات کا اثر عزاداری امام حسینؑ کے نظام پر بھی پڑا۔ بعض امام باڑے سونے ہوگئے اور ان کی عمارتیں شکستہ ہوگئیں۔ بعض امام باڑوں پر کسٹوڈین کا قبضہ ہوگیا۔ دوسرا مسئلہ خاتمۂ زمینداری نے پیدا کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ زمیندارانہ دور کی عزاداری کا نظام کیسے چلے گا، اس لیے کہ صوفیاء کی قائم کی ہوئی خلوص دل اور سادگی پر مبنی روایات کو تو زمیندارانہ کرّ وفر نے بہت پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ صوفیاء نے عزاداری امام حسینؑ کو مزدور، فن کار اور کاریگروں اور ان کے جذبات کے ساتھ جوڑ دیا تھا اور انہوں نے اپنے آپ کو اس نظام میں ضم کرلیا تھا۔ زمیندارانہ دور کی عزاداری داد و دہش اور بے گار پر مبنی تھی۔ خاتمۂ زمینداری کے بعد معاشی بحران شروع ہوا تو نہ تو داد و دہش رہی اور نہ ہی بے گار لینے کی قوت۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کہار کہاں سے ملیں گے۔ مراثیوں کو کہاں سے رقم دی جائے گی، مزدوروں کو مزدوری کون دے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس معاشی بدحالی کے دور میں کچھ دنوں تک تو دکھاوے پر پرانے نظام کو گھسیٹنے کی کوشش کی گئی، آخر میں سادگی پر اتر آئے۔ لیکن عزاداری امام حسینؑ حد درجہ محدود ہوچکی تھی۔ اس کے بعد ثقافتی بحران کا دور شروع ہوا۔ زبان و ادب کا مسئلہ پیدا

ہوا۔ اردو کے مقابلے میں دوسری زبانوں کو معاش سے جوڑ دیا گیا لہذا زبان کی مجبوریاں پیدا ہوئیں۔ نوحہ جو اپنے معنی کے اعتبار سے نوحہ ہی ہونا چاہئے اس کی طرز کو گانے کی طرز سے ملادیا گیا۔ پہلے نوحہ پڑھنے سے جو حزن و ملال پیدا ہوتا تھا اس کی جگہ فرحت کا احساس ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ جب نوحے کے معنی ہی نہیں جانتے تو اس کی روح کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ نئی نسل اور آنے والی نسلیں اس زبان و ادب سے قطعی طور پر ناواقف ہیں کہ جس میں عزاداری امام حسینؑ سے متعلق ذخیرے موجود ہیں۔

اب اکیسویں صدی پورے نظام زندگی کے لیے ایک چیلنج لے کر آرہی ہے۔ جہاں اور چیزیں متاثر ہوں گی وہاں نظام عزاداری بھی متاثر ہوگا۔ اس میں سب سے بڑا مسئلہ وقت کا ہوگا؟ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء، مجتہدین اور دانشور، اس آنے والی زندگی کے سوالات کے بارے میں غور وفکر کریں اور باقاعدہ طور پر اس ایجنڈے پر قومی کانفرنس منعقد کریں تاکہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش ابھی سے کی جاسکے۔ اس طرح کا رویہ نہ اپنائیں جو ہم نے تقسیم ہند اور خاتمۂ زمینداری کے مسائل سے متعلق اپنایا تھا۔ ابھی وہ نسل موجود ہے جس نے تقسیم ہند اور خاتمۂ زمینداری کے بعد کے معاشی بحران کو دیکھا تھا اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل کی وجہ سے صعوبتیں برداشت کی تھیں۔

ظاہر ہے کہ مذہبی عقیدہ تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ عزاداری امام حسینؑ تو ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔ لیکن جب کوئی مذہبی عقیدہ کسی سماج کا حصہ بن جاتا ہے تو تاریخ اور سماجیات کے طالب علم کی حیثیت سے ہم اس کے مختلف مراحل، ابتداء، فروغ اور اس کے انحطاط کا مطالعہ ان تینوں حیثیتوں میں کرتے ہیں۔ ہندوستان میں عزاداری امام حسینؑ کا قیام اور اس کا فروغ صوفیائے کرام کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اور جس طرح سے صوفیاء نے عزاداری امام حسینؑ کو ہندوستانی سماج میں وسعت بخشی اس حد تک اسے ہندوستانی سماج و ثقافت کا ایک جز و بنادیا، جس میں ہندو اور مسلمان خلوص دل سے شریک ہوئے۔ مسلمان تو رسول کے پیرو تھے اور محبت اہل بیت کو اجر رسالت سمجھ کر عزاداری میں شامل ہوتے لیکن ہندو تو اپنے دھرم پر قائم رہتے ہوئے حسینؑ کے پجاری بن گئے، یہ ان صوفیاء کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔ صوفی تحریک کمزور ہوئی، علماء کے درمیان مناظرہ شروع ہوا، عزاداری امام حسینؑ کو زمیندارانہ نظام کا حصہ بنادیا گیا، ہندو مسلمانوں اور شیعوں سنیوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس سب کا فائدہ برٹش حکمرانوں نے اٹھایا۔ ان تمام وجوہ سے عزاداری امام حسینؑ کو سخت نقصان پہنچا۔

آج شیعوں میں بھی تفریق پیدا ہوگئی۔ یہ سیدوں کا امام باڑہ ہے، یہ جولاہوں کا امام باڑہ ہے اور یہ فقیروں کا امام باڑہ ہے۔ اس سے عزائے حسینؑ کو مزید نقصان پہنچ رہا ہے۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیرو رہیں گے اس وقت تک عزاداری امام حسینؑ قائم رہے گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء اور دانشور اس عزاداری امام حسینؑ میں صوفیاء کی طرح اسلامی مساوات کے اصول کو قائم کریں تاکہ جملہ مسائل حل ہوسکیں اور عزاداری کے نظام کو جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ہوسکے اور عزاداری امام حسینؑ کی ہندوستان میں مزید ترویج و اشاعت ہوسکے۔